ملائکہ کرن
ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان
ڈاکٹر عذرا پروین
صدرِ شعبہ اردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان

مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کی مسدس "عوالی جواب مسدس حالی " کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

Malaika Kiran
MPhil Scholar, Department of Urdu, The Women University, Multan.
Dr. Azra Parveen
Chairperson, Department of Urdu, The Women University, Multan.

The Research and Critical Review of Molana Mohammad Farooq Chiryakoti's Musadas “Awwali Jawab Musadas Hali”

In the tradition of Urdu poetic literature, Musaddas-e-Hali by Maulana Altaf Hussain Hali stands as a literary masterpiece and a symbol of intellectual and cultural awakening in the Indian subcontinent. Its widespread acclaim not only earned it recognition among scholarly circles but also attracted ideological and critical responses from various writers. Among the notable poetic replies was Musaddas-e-Awali, authored by Maulana Muhammad Farooq Chiryakoti. Written as a direct response to Hali’s Musaddas, Musaddas-e-Awali addresses Hali’s critiques of disciplines such as medicine, chemistry, physics, philosophy, and logic. In doing so, Chiryakoti offers his perspective on the Islamic Renaissance and delivers a sharp critique of Western education and civilization. The work reflects the ideological tensions of the time and makes a meaningful contribution to the discourse on tradition versus modernity within the context of Muslim society in colonial India.

Key Words: *Maulana Altaf Hussain Hali, Urdu Literature, Mussaddas Mad-o-Jazar Islam, Mussaddas Hali, Mussaddas Awwali, Maulana Farooq Charya Koti, Philosophy, Western Education, Western Civilization.*

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ کی بغاوت ایک سنگ میل کے طور پر جانی جاتی ہے۔ یہ بغاوت نہ صرف انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی مزاحمت کی علامت تھی بلکہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو شدید جبر واستحصال کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں نے اس بغاوت کو کچلنے کے بعد مسلمانوں کے خلاف ظلم وستم کی نئی تاریخ رقم کی۔ ان مظالم نے مسلمانوں کو نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی وفکری طور پر بھی کمزور کر دیا۔ ان کی معاشی حالت بدتر ہو گئی اور تعلیمی نظام میں بھی بڑی کمی محسوس کی گئی۔ یہی وہ دور تھا جب سر سید احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالی جیسے فکری رہنماؤں نے مسلمانوں کو ان کے زوال سے نکالنے کے لئے ایک نیا شعور اور فکر دینے کی کوشش کی۔ سر سید احمد خان نے ۱۸۵۷ کی بغاوت کے بعد مسلمانوں کے تعلیمی احیا کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا پسماندہ ہونا تعلیم کے فقدان کی وجہ سے تھا۔ اس لئے انہوں نے جدید سائنسی اور مغربی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا اور مسلمانوں کو اس راستے پر گامزن ہونے کی ترغیب دی۔ ان کی کوششوں کا آغاز علی گڑھ تحریک سے ہوا، جہاں انہوں نے مسلمانوں کے لئے جدید تعلیمی ادارے قائم کئے۔ سر سید کا موقف تھا کہ مسلمانوں کو جدید علوم کے ساتھ ساتھ ان کی ثقافت اور مذہب سے بھی جڑا رکھنا ضروری ہے۔ علی گڑھ میں قائم ہونے والی تعلیمی / علمی اداروں نے مسلمانوں کو نہ صرف جدید تعلیم سے روشناس کیا بلکہ ان میں خود اعتمادی پیدا کی اور احساسِ محرومی سے نجات دلائی۔

مولانا الطاف حسین حالی نے سر سید کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں جہاں ایک طرف ہندوستانی عوام انگریزوں کے ظلم و جبر کا شکار تھے، تو دوسری طرف ان کے اندر اپنے شاندار ماضی کی یادوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور موجودہ معاشرتی، مذہبی، سیاسی، اور معاشی بدحالی سے نجات حاصل کرنے کی شدید خواہش بھی بیدار ہو چکی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب شاعر و ادیب مولانا حالی نے اپنی تخلیقی قوت کو قوم کی اصلاح اور فلاح کے لیے وقف کرنے کا عزم کیا۔ حالی نے اپنے مرشد سر سید احمد خان کی رہنمائی میں ادب اور شعر کے ذریعے ایک ایسا انقلاب لانے کا فیصلہ کیا جس کی مدد سے مسلمانوں کو ان کے ماضی کی عظمت اور حال کی پستی کا پتا چل سکے۔ انھوں نے یہ مقصد اپنے کلام میں جاندار اور موثر انداز میں پیش کیا، اور اسی مقصد کے تحت انھوں نے ۱۸۷۹ء میں اپنی مشہور نظم "مسدس مدوجزر اسلام" تخلیق کی۔ یہ نظم نہ صرف تاریخ اسلام اور مسلمانوں کے زوال پذیر حالت کی عکاس ہے، بلکہ اس میں انسانی دردمندی، فطری سادگی، حقیقی صداقت اور ایک سچے تخلیقی وجدان کا اظہار بھی ہے۔ اسے وقت کا آئینہ بھی کہا جاسکتا ہے کیونکہ اسی آئینے میں الطاف حالی نے ہندوستانی اور اسلامی تہذیبی اور

تاریخی صورت حال کا مطالعہ کیا (بالخصوص ۱۸۵۷ کے بعد کی صورت حال) اور اسے مسدس کی صورت میں نظم کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کا عروج ایک وقت تھا، لیکن اب ان کی حالت میں زوال آچکا تھا۔

حالی نے اس نظم میں مسلمانوں کی معاشرتی، مذہبی اور سیاسی بد حالی کی تصویر کشی کی، اور ساتھ ہی اس بات کا ادراک بھی کر لیا تھا کہ ان کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے حقیقی اصلاحات اور درست سمت میں محنت کی ضرورت ہے۔ یہ مسدس اس وقت کی ایک نکتہ چینی اور فکری اصلاح کا پیغام بن گئی تھی، جس نے مسلمان معاشرت کے تمام پہلوؤں پر سوالات اٹھائے اور ایک نئی سمت کی طرف رہنمائی فراہم کی۔ مسدس حالی کا تخلیقی عمل نہ صرف ایک شاعر کے وجدان کا اظہار تھا بلکہ یہ ایک بڑی اصلاحی تحریک کا حصہ بھی تھا۔

مسدس سے پہلے چار اشعار الگ سے پیش کیے گئے ہیں۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد

اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے [1]

یہ مسدس ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں، یعنی تقریباً ۱۴۵ سال قبل لکھا گیا تھا۔ اس طویل عرصے میں مسدس حالی کی جتنی اشاعتیں منظر عام پر آئی ہیں اتنی اشاعتیں اردو کی کسی دوسری کتاب کی منظر عام پر نہیں آئی۔ ان اشاعتوں میں عام اشاعتیں بھی شامل ہیں اور خاص اشاعتیں بھی۔ حالی کے معروف محقق اسماعیل پانی پتی رقم طراز ہیں:

> "یہ ماہ جون ۱۸۷۹ مطابق جمادی الثانی ۱۲۹۶ھ میں مطبع سے چھپ کر نکلی اور نکلتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی۔ مسدس کا دوسرا ایڈیشن مولانا نے ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰) میں چھپوایا پہلا اور دوسرا دونوں ایڈیشن بلا ضمیمہ تھے۔ تیسرا ایڈیشن ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶) میں مولانا نے شائع کیا" [2]

مسدس کی اشاعت کے بعد اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ مسدس ہر طبقے کے لوگوں کی زبانوں پر چھا گئی، خواہ وہ بچے ہوں یا بزرگ، جاہل ہوں یا عالم، واعظ ہوں یا عوام۔ مکتبوں میں اس کا تذکرہ کیا جاتا، اسکولوں میں اس کے منتخب حصے پڑھائے جاتے، میلاد کی مجالس میں یہ گائی جاتی، اور وعظ کی محفلوں میں اس سے جوش پیدا کیا جاتا۔ اس طرح یہ مسدس معاشرت کے ہر طبقے، ہر گوشے اور ہر کونے میں پھیل گیا۔

"قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے مولود شریف کی مجلسوں میں جابجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبانوں پر جاری ہیں"[۳]

ایک طرف علی گڑھ تحریک، سر سید اور مولانا حالی کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا، تو دوسری طرف ان کے حاسدین اور مخالفین بھی بڑھ رہے تھے۔ "سر سید کے اقدامات اور ان کے اجتہادی افکار کی وجہ سے انہیں غدار، کافر، نیچری، خارجی اور کرسچن جیسے الزامات سے نوازا گیا۔"[۴] حالانکہ مولانا حالی کو اس طرح کے الزامات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، لیکن انہیں شدید ادبی مخالفت کا سامنا ضرور ہوا۔ خاص طور پر "اودھ پنچ" اور پنجابی حلقوں نے حالی کو اپنے سخت اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان پر مختلف الزامات عائد کیے۔ اردو کے کئی رسائل، جن میں اودھ پنچ اور تیرہویں صدی جیسے رسائل شامل تھے، ہمیشہ سر سید اور مولانا حالی کی مخالفت کرتے تھے۔ ان مخالف رسائل میں کئی اخبارات اور ادبی جریدے شامل تھے، تاہم اودھ پنچ ان میں سب سے آگے تھا۔ خوش قسمتی سے، اودھ پنچ کے لکھنے والے تمام اہل کمال تھے،۔

" اودھ پنچ" کے مضمون نگار منشی سجاد حسین، اکبر الہ آبادی، اور مچھو بیگ ستم ظریف بھی ان کے مخالفین میں شامل تھے۔"[۵]

اس لیے ان کے اعتراضات میں نہ صرف وزن تھا بلکہ ان کی ادبی شان بھی نمایاں تھی۔ وہ طنز و مزاح کے تیر اس انداز میں چلاتے تھے کہ زخم بھی مسکرانے پر مجبور ہو جاتے۔ حالی کی مسدس کے شائع ہونے کے بعد اس پر ادبی، سماجی، سیاسی، اور مذہبی سطح پر مخالفت کی ایک لہر اُٹھی۔ بہت سے معروف شاعروں، ادیبوں، اور علما نے مسدس کا جواب دینے کے لیے اپنی تحریریں پیش کیں۔

" ان مخالفتوں کا دائرہ صرف مسدس تک محدود نہیں رہا بلکہ حالی کی دیگر نظمیں بھی ان کی تنقید کا نشانہ بنیں۔ وہ تمام نظمیں جو حالی نے مختلف محفلوں یا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں پیش کی تھیں، ان پر بھی اعتراضات کیے گئے۔"[۶]

حالی کی سادگی اور اسلوب نے انہیں بعض حلقوں میں تنقید کا سامنا کیا۔ خاص طور پر انہیں اردو کی خالص فصاحت سے ہٹ کر ایک غیر روایتی اسلوب اختیار کرنے پر اعتراضات کا سامنا تھا۔ تاہم، جو اہلِ بصیرت قوم کے

زبوں حالی کو سمجھتے تھے، انہوں نے حالی کی اس سادگی میں ایک گہری معنویت اور قومی درد کو محسوس کیا۔ ان کے مطابق، حالی کی شاعری میں جو سادگی تھی، وہ دراصل قوم کے درد اور احیا کی آواز تھی۔

> "مزید براں حالی کی نظر میں یہاں ایک ایسا دستر خوان چنا گیا جس پر ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کا گمان گزرتا تھا حالی کہ اس بیان کی اصلیت کو سمجھنا مشکل نہیں انہوں نے روایت زمانہ کے برعکس مسدس کی بنیاد جس موضوع پر رکھی تھی اس کا چلن ہماری شاعری میں عام نہ تھا۔"[۷]

مسدس حالی کو اردو ادب میں ایک انقلابی موڑ کے طور پر سراہا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ تمام آوازیں جو مسدس کی مخالفت میں بلند ہوئیں، کمزور پڑ گئیں اور وہ تحریریں جو اس کی مخالفت میں لکھیں گئیں، اپنے اثرات کھو بیٹھیں۔ آج بھی مسدس حالی ایک زندہ ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کے اثرات اردو ادب اور فکری تاریخ میں باقی ہیں۔ اس کے باوجود، مسدس کی مخالفت کرنے والے بیشتر وہ علما اور دانشور تھے جو قدیم علوم و فلسفے کے ماہر تھے، مگر جدید تحقیق اور مغربی افکار سے ناواقف تھے۔ وہ مغربی تمدن کو ایک خطرہ سمجھتے ہوئے اپنی محدود دنیا میں جینے کو ترجیح دیتے تھے۔ ایسے میں حالی کا اصلاحی پیغام ان کے لیے اجنبی اور قابلِ اعتراض ثابت ہوا۔ لیکن تاریخ نے یہ ثابت کیا کہ حالی کی سادہ زبان، گہرے درد اور بیدار ذہن نے جو پیغام دیا، وہی ملت کی فکری بیداری کا سنگِ میل ثابت ہوا۔ حالی کی مسدس "مد و جزر اسلام" کو بھی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے جواب میں نہ صرف ذاتی سطح پر بلکہ ایک منظم فکری مہم کی صورت میں جوابی مسدس لکھے گئے۔ یہ جوابی تحریریں دو طرح کی تھیں: ایک وہ جو حالی کی زبان پر حملے کرتی تھیں اور اس کی سادگی کو تنقید کا نشانہ بناتی تھیں، اور دوسرے وہ جو حالی کے خیالات پر اعتراض کرتی تھیں اور ان کا مؤقف تھا کہ حالی نے مسلمانوں کے سنہری ماضی کو محدود کر کے پیش کیا اور حال کو ضرورت سے زیادہ تاریک دکھایا۔

"مسدس کی مخالفت میں مختلف شہروں جیسے لکھنؤ، دہلی، علی گڑھ، لاہور، پٹنہ اور گورکھپور کے علمی حلقے پیش پیش تھے، اور خاص طور پر لکھنؤ میں اس پر سب سے زیادہ تنقید کی گئی۔"[۸] ان جوابی تحریروں میں سے کچھ کا مقصد صرف زبان کی توہین تھا، جبکہ دیگر نے حالی کے فکری بیانیے کو چیلنج کیا۔ "تحفظِ اسلام" کے نام پر مسدس کے خلاف لکھے گئے ان جوابی مسدسوں میں مزاحیہ اور طنزیہ بیانیہ تشکیل پایا، جس میں مختلف الفاظ جیسے "خالی"، "خیالی"، "موالی" اور "ڈفالی" کا استعمال کر کے متعدد مسدس لکھے۔ مسدس حالی کے جواب میں لکھے گئے متعدد

مسدس میں سے ایک اہم مسدس "مسدس عوالی بجواب مسدس حالی" مصنف قاضی محمد فاروق چریا کوٹی کا تعارف و تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

مسدس عوالی جواب مسدس حالی مصنف قاضی محمد فاروق چریا کوٹی

چریا کوٹ کا شمار اسلامی تاریخ کے بڑے علمی اور روحانی مراکز میں ہوتا ہے۔ یہ جگہ اعظم گڑھ اور غازی پور کے درمیان واقع ہے، اور یہاں سے کئی نامور علماء اور مفکرین پیدا ہوئے۔ چریا کوٹ کی سب سے اہم شخصیت مولانا محمد فاروق چریا کوٹی ہیں۔ انہوں نے اپنے دور میں علمی میدان میں بڑا اثر چھوڑا۔ مولانا محمد فاروق عباسی نہ صرف ایک بہترین استاد تھے، بلکہ ان کی علمی دلچسپی اور تحقیق کی قابلیت بھی بہت قابل تعریف تھی۔ وہ ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد قاضی علی اکبر عباسی چریا کوٹی تھے اور ان کے بھائی مولانا عنایت رسول عباسی تھے۔ اس طرح ان کی شخصیت کا اثر صرف تعلیم تک محدود نہیں تھا، بلکہ انہوں نے علمی دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ "رشک یونان و شیراز ، دارالعلم پرگنہ چریا کوٹ میں ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ "(۹)

مولانا محمد فاروق عباسی نے اپنی اعلیٰ تعلیم کے دوران برصغیر کے مشہور علماء سے استفادہ کیا، جس سے ان کی علمی بصیرت اور فکری تربیت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے علمِ ہیئت مولانا رحمت اللہ فرنگی محلیؒ سے سیکھا اور فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم مفتی محمد یوسف فرنگی محلیؒ سے حاصل کی، جو اس وقت کے بڑے فقہ حنفی ماہر تھے۔ آپ نے علمِ منطق کی تفصیلات مولانا ابو الحسن منطقیؒ سے سیکھیں، جنہوں نے آپ کے منطقی سوچ کو مزید مستحکم کیا۔ ان علمی تعلقات نے آپ کی فکری ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور آپ کی شخصیت کو مزید نکھارا۔ مولانا محمد فاروق عباسی نے علمِ ادب کی گہرائیوں کو صرف کتابوں سے نہیں، بلکہ اپنے فطری ذوق اور تخلیقی صلاحیت سے بھی سمجھا۔ آپ کی علمی تربیت صرف کتابوں تک محدود نہیں تھی، بلکہ آپ نے علم و ادب کے ماہرین کا براہِ راست مشاہدہ بھی کیا۔ ان سب چیزوں نے آپ کو علما و فضلا میں ایک خاص مقام دلایا، اور آج بھی آپ کی شخصیت نئی نسل کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ وسیم راشد رقم طراز ہیں:

> "آپ کو علوم معقولی و منقولی اور ریاضیات و ادبیات سب پر عبور ہو گیا۔ ریاضی کی ایک شاخ موسیقی بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے اور فنون کی طرح اس فن کو بھی اس دور کے کسی اُستاد سے باقاعدہ پڑھا اور اس میں بڑی دستگاہ حاصل کی "(۱۰)

مولانا محمد فاروق عباسی کا علم حاصل کرنے کا جذبہ انہیں حجاز لے آیا، جہاں انہوں نے حرمین شریفین کی زیارت کی۔ یہاں نہ صرف عبادات کا روحانی فائدہ حاصل کیا، بلکہ علم و تصوف کے ماہرین کی صحبت سے اپنی فکری اور روحانی تربیت بھی کی۔ آپ کی شخصیت میں علم اور روحانیت کا بہترین امتزاج تھا۔ آپ نے فقہ اور تصوف دونوں کو ساتھ ساتھ اپنایا، یہ ثابت کرتے ہوئے کہ دونوں میں کوئی تضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کی زندگی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ علم اور روحانیت کا توازن انسان کی مکمل ترقی کے لیے ضروری ہے۔ مولانا کی علوم وفنون پر دسترس کے حوالے سے محمد افروز چڑیاکوٹی رقم طراز ہیں:

"ابو الجمال مولانا احمد مکرم عباسی چریاکوٹی کے بقول مولانا فاروق چریاکوٹی کو علم تفسیر و حدیث، فقہ و کلام قراءت و تصوف، ھیأت و نجوم، عروض و بلاغت، نحو و صرف، لغت وأسماء الرجال، منطق و فلسفہ اور جفر و اقلیدس وغیرہ میں ید طولی حاصل تھا۔"[۱۱]

مولانا فاروق چریاکوٹی نے شبلی نعمانی کی فکری اور روحانی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ شبلی کی ابتدائی تربیت اور نظریات کی بنیاد مولانا فاروق چریاکوٹی نے رکھی تھی، جن کی رہنمائی کے بغیر شبلی کی کامیاب تحریک ممکن نہ تھی۔ سید سلیمان ندوی کی شخصیت کی تشکیل میں بھی مولانا فاروق چریاکوٹی کا بڑا ہاتھ تھا۔ مولانا فاروق نے مختلف مدارس میں تدریس کی، ابتدا مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی کے مدرسہ چشمہ رحمت سے کی، پھر اعظم گڑھ، سہرام، الہ آباد اور آخر کار دارالعلوم ندوہ میں "ادیب اول" کے عہدے پر فائز ہو کر اپنی خدمات کو وسیع کیا۔ ۱۹۰۹ء میں غازی پور میں انتقال ہوا۔ آپ کے صاحب زادے مولانا محمد مبین کیفی، مفتی محمد یسین اور پروفیسر محمد امین چڑیاکوٹی تھے۔[۱۲]

مسدس مد و جزر اسلام کے جواب میں مولانا قاضی محمد فاروق چریاکوٹی نے ایک اہم ادبی و علمی کارنامہ "ذخر المعارف تذکرہ العلوم مع عوالی جواب مسدس حالی" ہے۔ یہ مسدس سنہ ۱۳۱۹ھ /۱۹۰۱ میں محمد عبد العلی آسی مدراسی نے لکھنؤ سے شائع کی۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے: پہلا حصہ ۴۰ صفحات پر مشتمل اردو نثر میں ایک تحقیقی مقدمہ ہے، جس میں اسلامی علوم اور ان کے ارتقاء پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا حصہ "عوالی بجواب مسدس حالی" ایک منظوم جواب ہے، جس میں مولانا فاروق چریاکوٹی نے حالی کی اس نظم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، جس میں حالی نے اسلامی نشاۃ ثانیہ (یعنی اسلام کا دوبارہ عروج) کے بارے میں بات کی تھی اور مختلف علمی شعبوں جیسے طب، کیمیا، طبیعیات، فلسفہ اور معقولات پر اعتراضات اٹھائے تھے۔ انہوں نے حالی کے ان خیالات کو چیلنج کیا اور بتایا کہ اسلامی تاریخ میں بھی یہ تمام علوم موجود تھے اور مسلمانوں نے ان میں اہم کارنامے سرانجام دیے تھے۔

حالی نے جہاں جہاں مغربی تعلیم اور تہذیب کی تعریف کی تھی، مولانا فاروق چریاکوٹی نے اس پر تنقید کی۔ ان کا موقف تھا کہ مغربی تہذیب نے مسلمانوں کو اپنی اصل روایات سے دور کر دیا ہے اور مسلمانوں کو اپنی قدیم عظمت اور تعلیمات کی طرف واپس جانا چاہیے۔

مسدس مد و جزر اسلام کی پہلی اشاعت ۱۲۹۶ھ /۱۸۷۹ میں ہوئی، جس نے اردو نظم کو ایک نیا فکری زاویہ اور تاریخی شعور دیا۔ اس میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ، زوال اور امیدوں کا ایک گہرا بیان تھا۔ مسدس کی پہلی اشاعت کے آخری اشعار اتنے مایوس کن تھے کہ قاری کو اندھیروں میں ڈبو دیتے تھے، لیکن قوم کی توجہ نے انہیں نیا عزم دیا اور وہ مایوسی کو ترک کر کے اصلاح کا جذبہ پیدا کرنے لگے۔ مولانا حالی نے خود کہا کہ " نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے "(۱۰)۱۳۰۳ھ /۱۸۸۶ کی تیسری اشاعت میں مسدس کا دوسرا دیباچہ شامل کیا گیا، جس سے نظم میں توازن آیا اور مایوسی کے ساتھ امید کی کرن روشن ہوئی کتاب کے آخر میں مولانا کے شاگرد حبیب الدین کا ایک چھوٹا رسالہ شامل ہے جس میں مولانا کی علمی خدمات اور شخصی خصوصیات کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں مولانا کے دو اردو قصائد اور ایک فارسی مرثیہ بھی شامل ہے جو ان کی زبان دانی کی مہارت کو ظاہر کرتے ہیں۔

مولانا قاضی محمد فاروق چریاکوٹی کا مسدس "عوالی بجواب مسدس حالی" مسدس مد و جزر اسلام کا تنقیدی جواب تھا حالانکہ مسدس حالی کا دوسرا حصہ ۱۳۰۳ھ میں شائع ہو چکا تھا، لیکن مولانا فاروق چریاکوٹی نے اس پر رد عمل نہیں دیا، اور ان کی جوابی نظم ۱۳۱۹ھ /۱۹۰۱ میں شائع ہوئی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے فاروق چریاکوٹی نے جوابی مسدس تحریر کرنے کے لیے مسد حالی کی پہلی اشاعت کو ہی بنیاد کیوں بنایا؟ اس کی تیسری اشاعت جس میں ضمیمہ بھی شامل تھا اور جو ان کی نظم کی تخلیق سے کم و بیش سولہ سال قبل شائع ہو چکا تھا، ان کا یہ عمل اس گمان کو تقویت دیتا ہے کہ انہوں نے مسدس حالی کے ضمیمہ کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ غالباً وہ پہلی اشاعت پر ہی رد عمل دینا چاہتے تھے کیونکہ اس میں سرسید کی تعلیمی نظریات اور روایتی تعلیم پر تنقید کی گئی تھی۔

"عوالی بجواب مسدس حالی" میں مجموعی طور پر ۸۲ بند شامل ہیں، جن میں سے ۱۵ بند مولانا حالی کی "مسدس مد و جزر اسلام" سے منتخب کیے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان منتخب بندوں کی ترتیب بہت غیر روایتی اور منتشر ہے، حالی کی مسدس کے مختلف حصوں سے بند چُنے گئے اور ان کے جواب نظم کیے گئے۔ مولانا فاروق چریاکوٹی نے ان بندوں کے جوابات ترتیب سے نہیں دیے بلکہ ہر بند کو ایک علیحدہ عنوان کے تحت رکھ کر جواب نظم

کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، "حالی در مذمت شاعری" کے تحت ایک عنوان ہے اور اس کا جواب "جواب انتخاب" کے نام سے دیا گیا ہے۔ اسی طرح "حالی در ہجو علمائے شریعت" کا جواب "جواب دندان شکن" اور "حالی در ذم وضع اہلِ زمانہ" کا جواب "جواب باصواب" کے عنوان سے دیا گیا ہے۔ اس ترتیب سے نہ صرف فکری تضاد واضح ہوتا ہے بلکہ ایک منظم اور مناظرانہ انداز بھی دکھائی دیتا ہے، جہاں ہر اعتراض کو الگ الگ واضح کیا گیا ہے اور اس کا جواب فکری قوت سے نہیں، زبان کی قوت اور ترتیب کے ساتھ دیا گیا ہے۔

"مسدس عوالی" کے ابتدائی سات بند حمد و نعت پر مبنی ہیں، جو اس کے روحانی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ پہلا بند عربی زبان میں ہے جس کا مقصد اس پورے ادبی کام کو ایک مذہبی اور روحانی پس منظر فراہم کرنا تھا۔ تاکہ قارئین کے لیے ایک مذہبی بنیاد فراہم کر دی جائے اور اس طرح ان کے مذہبی جذبات کو ابھارا جاسکے اور اپنے خیالات اور مقاصد سے اپنا ہمنوا بنایا جاسکے۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ "مسدس عوالی" نہ صرف ایک تنقیدی جواب ہے، بلکہ ایک فکری اور ادبی محاذ پر ایک منظم اور لسانی طور پر مضبوط رد عمل بھی ہے۔

مولانا فاروق چریا کوٹی کے مسدس کا عربی میں تحریر کردہ پہلا بند ملاحظہ فرمائیے:

لك الحمد يا من خلقت الرايا   و حليتهم من عيون المزايا
افضت عليهم مجال العطايا   قنا و اكفنا شرعول الرزايا
وصل على خاتم المرسلينا
نبياً كريماً رسولاً امينا[۱۴]

"الرایا" سے مراد دین کا پرچم یا اسلام کا پیغام ہے۔ اس مصرعے میں اللہ کی تخلیق کی عظمت اور دین کی سربلندی کا ذکر کیا گیا ہے۔ "قناو اکفنا شرعول الرزایا" اس میں اللہ سے دعا کی جارہی ہے کہ ہمیں مصیبتوں سے بچا، یعنی "ہمیں بد قسمتی اور آزمائشوں سے بچا کر رکھ۔" افضت عليهم مجال العطايا" اوراے اللہ اپنی رحمت اور انعامات کے دروازے کھول دیے اور اپنے بندوں پر بے شمار عطیات نازل کیے۔"وصل علی خاتم المرسلینا" یہاں اللہ کے آخری نبی، حضرت محمد ﷺ پر درود بھیجا جارہا ہے، یعنی ان کی شخصیت پر مکمل عقیدت اور محبت کا اظہار کیا جارہا ہے۔" نبیاً کریماً رسولاً امینا" اس میں حضرت ﷺ کی تعریف کی جارہی ہے کہ وہ ایک نیک (کریم) نبی اور ایک امانت دار (امین) رسول ہیں۔

حمد و نعت کے بعد، آٹھویں بند میں مولانا کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

پسند آتے مجھکو یہ اشعار حالی کہ دی جس میں ہے داد نازک خیالی
حلی صفا سے سراسر ہیں حالی عیوب کدورت سے یکسر ہیں خالی
معائب کے اپنے وہ خود معترف ہیں
تواضع کے انبار سے معترف ہیں(۱۵)

یہاں فاروق چریاکوٹی نے حالی کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ ان اشعار میں ایک خاص لطف اور حقیقت ہے جو اسے پسند آتی ہے۔ ان کے اشعار میں کوئی کدورت یا عیب نہیں ہے، بلکہ وہ بالکل صاف اور معصوم ہیں۔ کوئی بھی فساد یا گندگی نہیں ہے۔ حالی کی شخصیت میں اتنا انکسار اور سچائی ہے کہ وہ اپنے عیبوں کو چھپاتے نہیں تھے، بلکہ ان کا خود اعتراف کرتے تھے۔ فاروق چریاکوٹی مولانا حالی کے تواضع اور انکسار کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ ہر معاملے میں عاجزی اختیار کرتے ہیں۔

اس کے بعد، ۲۴۹ویں بند کو شامل کیا گیا ہے جس کا آغاز "وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر" سے ہوتا ہے، "حالی در مذمت شاعری" کے عنوان کے تحت اس کو درج کیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں جو بند لکھا گیا ہے، وہ "جوابِ انتخاب" کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔

تھے شعر آپ کے پیشتر ملک گوہر ھوئے آج سنڈ اس سے کیوں وہ بدتر
جب آنے لگی اس میں بدبوئے نیچر ھوئے ایک دم میں وہ گندے سراسر
وہ اشعار تعویذ دل حرزِ جاں ہیں
جو اسلام کے واصف و مدح خواں ہیں(۱۶)

"جواب انتخاب" مولانا قاضی محمد فاروق چریاکوٹی کا ایک حیران کن رد عمل ہے، جس میں انہوں نے مولانا حالی کی شاعری پر تبصرہ کیا کہ جو اشعار انہوں نے اسلام کی ستائش کے بارے میں لکھے، وہ حقیقت میں اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ مولانا حالی نے جن اشعار کو اسلام کی تعریف سمجھا، ان میں دراصل کچھ پہلو اسلامی تعلیمات کے بر خلاف تھے، حالانکہ کچھ اشعار دلکش ضرور تھے۔

مسدس مد و جزر اسلام کا ۱۲۱واں بند، جس کا آغاز "ہماری ہر ایک چال میں سفلہ پن ہے" سے ہوتا ہے، مولانا حالی کی فکری مایوسی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس میں وہ اپنے عہد کے مسلمانوں کی زبوں حالی، اخلاقی پستی اور تہذیبی انحطاط پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ مولانا قاضی محمد فاروق چریاکوٹی نے اس بند کو "حالی ذم وضع اہلِ زمانہ"

کے عنوان سے "عوالی بجواب مسدس حالی" میں درج کیا ہے اور اس کے جواب میں "جواب باصواب" کے عنوان سے رد عمل پیش کیا۔

اس کی ہر اک چال میں سلفہ پن ہے　　جو چھوڑے ھوئے وضع اھل وطن ھے
کمینوں کے مانند ان کا چلن ھے　　بدوں کا جو ھم ریش و ھم پیرھن ھے
ولے آپ سے دور تر ھے یہ زشتی
یہ کہنا ھے از راہِ نیکو سرشتی (۱۷)

فاروق چریا کوٹی حالی کے مخالف نہ تھے نہ وہ انھیں برا سمجھتے تھے لیکن چونکہ حالی سرسید کے ساتھ تھے اور ان کے فکر و نظریات کو پھیلانے کا باعث بن رہے تھے اس لیے فاروق چریا کوٹی ان کے بھی مخالف ہو گئے۔ وہ سرسید اور ان کے رفقا کو 'کمینہ، سفلہ، بد، زشت" جیسے الفاظ سے پکارتے ہیں اور حالی کو "ولے آپ سے دور تر ہے یہ زشتی " کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

اس بند کے بعد، مولانا قاضی محمد فاروق چریا کوٹی نے مولانا حالی کے ان اشعار پر تنقید کی، جن میں انہوں نے مسلمانوں کی قدیم سائنسی روایات جیسے طب، کیمیا، طبیعیات اور فلسفہ کو غیر موثر اور فرسودہ قرار دیا تھا۔ حالی نے اپنی شاعری میں یہ بات کہی تھی کہ مسلمانوں کا علمی زوال اس لیے ہوا کہ انہوں نے تحقیق کو چھوڑ دیا اور صرف اپنے اسلاف کی کتابوں پر انحصار کرنا شروع کر دیا، اور نئی علمی کوششوں کو کفر اور بدعت سمجھا۔ حالی کی اس تنقید میں مغربی سائنسی ترقی سے متاثر ہونے کا بھی تاثر تھا، اور ساتھ ہی یہ روایت سے بغاوت کا انداز بھی تھا۔ مولانا چریا کوٹی، جو خود علمِ معقولات کے ماہر تھے، نے اس تنقید کو اپنے علمی تشخص پر حملہ سمجھا۔ چریا کوٹی نے "جواب باصواب" کے ذریعے مولانا حالی کو علمی اور فکری توازن کے ساتھ جواب دیا، لیکن جب فلسفہ، منطق اور عقلی علوم کی توہین کی گئی، تو انہوں نے "جواب دندان شکن" کے تحت ایک سخت اور جارحانہ رد عمل دیا، جو نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ جذباتی سطح پر بھی بہت طاقتور تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ علمِ کیمیا اس وقت اتنی ترقی کر چکا تھا کہ یونانی نظریہ "اربعہ عناصر" تاریخ کا حصہ بن چکا تھا، اور ۶۳ عناصر دریافت ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود، مولانا چریا کوٹی نے اپنے علمی وفاداری کے تحت اسی قدیم نظریے کو سچائی کا سنگِ بنیاد سمجھا، کیونکہ وہ اسے اپنے تہذیبی ورثے سے جڑا ہوا سمجھتے تھے۔ مولانا حالی نے جو بند ہماری طب اور ہمارے طبیبوں کی مذمت میں تحریر کیے ہیں۔

طبیبانِ اسلام جو اہل فن ہیں — وہ معنی شناس اور اہل سخن ہیں
وہ سرمایہ ربط روح و بدن ہیں — مخالف جو ان کے ہیں سب راہزن ہیں
انہیں کی سدیدی انہیں کا ھے قانوں
تجارت سے ثابت کئے جن کے مضموں
جو ملکوں میں ہیں خاندانی اطبا — بہت نسخے ھیں لکھ چکے جن کے آبا
ہر اک پر ہیں ان کے تجارب بھی صدہا — کہیں کیوں نہ اس کو بیاض مسیحا
ہے اس قوم کا ایک عالم پہ احساں
ہے کس طرح سے ان کی نعمت کا کفراں
ھو غش جس پہ تم اور تمہارے اطبا — فن کیمیا یا ھو تشریح اعضا
سمجھتے ھو جس سے تم ان کو مسیحا — اسی پر طبابت کا ان کو ھے دعوا
ھماری طبیعی کا یک جزو فن ھے
وھاں قشر اس جا یہ مغز سخن ھے (۱۸)

"مسدس مد و جزر اسلام" میں مولانا حالی نے بند نمبر ۲۳۲، ۲۳۳ اور ۲۳۵ میں فلسفہ، منطق اور عقلی علوم کے ماہرین پر سخت تنقید کی۔ انہوں نے ان علوم کو پرانا اور غیر موثر قرار دیا اور ان کی علمی بنیادوں کو کمزور ظاہر کیا۔ ان کے مطابق، یہ علوم مسلمانوں میں ذہنی سست روی پیدا کرنے کا سبب بنے اور قوم کو فکری انتشار میں مبتلا کر دیا۔ مولانا حالی کا کہنا تھا کہ ان علوم کا دفاع اب صرف ذہنی تعصب کی علامت بن کر رہ گیا تھا۔ اس پر رد عمل دیتے ہوئے، مولانا قاضی محمد فاروق چریا کوٹی، جو خود ان علوم کے ماہر اور ان کے حامی تھے، نے "جواب دندان شکن" کے نام سے جواب دیا۔ اس جواب میں انہوں نے نہ صرف اپنے موقف کی وضاحت کی بلکہ ایک مضبوط دفاع بھی پیش کیا، جس میں انہوں نے اپنی تہذیبی وابستگی اور علمی عزت کا دفاع دلائل کے ساتھ کیا۔

مولانا حالی نے آسمانی کتابوں جیسے زبور، توریت اور انجیل کو انسانی تحریف یا وقتی ضرورت کے باعث نسخ کے قابل سمجھا، لیکن انہوں نے یونانی فلاسفہ کے اصولوں کو "نا قابلِ تنسیخ" تسلیم کیا، جو ایک فکری تضاد تھا۔ مولانا چریا کوٹی کا رد عمل اس فکری تضاد کو سامنے لاتا ہے، جہاں "تجدید" کے نام پر بعض موروثی حقیقتوں کو رد کیا گیا اور غیر اسلامی علمی ورثے کو بغیر کسی سوال کے تسلیم کر لیا گیا۔ اس میں درپردہ سر سید کے عقائد پر بھی تنقید کی گئی ہے۔

ولیکن جو تھے آپ کے پیر فانی فدا جن نے یورپ پہ کی زندگانی
انہیں کی کتابوں کی سنتے کہانی سمجھتے تھے ھر ایک کو آسانی
کہا گیر کسی ملحد مغربی نے
تو کہتے "کہا میرے پیارے نبی نے "!(۱۹)

کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی مغرب (یورپ) کی تہذیب و تمدن پر **"فدا"** کر دی یعنی اس کے خیالات، رسم ورواج، تعلیم و فلسفہ کو زندگی کا مرکز بنالیا۔

لیکن جس ذاتِ مبارک (حضرت محمد ﷺ) پر حقیقت میں فدا ہونا تھا یعنی جو **"پیر فانی"** یعنی ہمارے رہنما، نبی، اور راہ دکھانے والے تھے — انہیں بھلا دیا گیا۔

یہاں "پیر فانی" حضور اکرم ﷺ کی طرف اشارہ ہے۔

ہوئے گاہ آدم سے حوا سے منکر کبھی تابش دست موسیٰ سے منکر
مسیحا کے احیائے موتیٰ سے منکر بلا آب وجود مسیحا سے منکر
نہیں اس میں برھان وصحت کی حاجت
جسے لکھ گئے اہل یورپ کے حضرت (۲۰)

یہاں مولانا ان لوگوں پر تنقید کر رہے ہیں جو مغربی فلسفے کے زیر اثر آکر قرآن میں بیان کردہ معجزات اور دینی حقائق کا انکار کرنے لگتے ہیں: "تابشِ دستِ موسیٰ" یعنی حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ چمکنے لگتا تھا (معجزہ)، اسے وہ سائنسی اصولوں کے خلاف سمجھ کر جھٹلا دیتے ہیں۔ وہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کے تخلیق کے واقعے کو "مذہبی کہانی" قرار دے کر اسے رد کر دیتے ہیں۔ یہ سب مغربی سائنسی فکر سے متاثر ہو کر کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ تمام باتیں ایمان کا حصہ ہیں۔ مغرب زدہ ذہن حضرت عیسیٰؑ (مسیحا) کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو بھی نہیں مانتا، اور انکے مردوں کو زندہ کرنے کے معجزے کا بھی انکار کرتا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں قرآن میں صراحت سے موجود ہیں، لیکن چونکہ سائنسی نظریات کے مطابق ممکن نہیں، اس لیے وہ ایمان لانے کے بجائے انکار کر دیتے ہیں۔ مولانا فاروق چریا کوٹی ان اشعار کے ذریعے فکری غلامی کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ وہ خبردار کرتے ہیں کہ جس مسلمان کا دل مغرب کی روشنی میں اتنا اندھا ہو جائے کہ وہ انبیاء کے معجزات کو ماننے سے انکار کر دے، اور مغرب کے فلاسفہ کی باتوں کو وحی سمجھ کر قبول کرے، وہ حقیقت میں اپنی ایمانی بنیادیں کھو چکا ہے۔

"مسدس مد و جزر اسلام" کے بند ۲۳۰ سے ۲۴۰ تک مولانا حالی نے علما کی علمی پسماندگی اور جمود پر شدید تنقید کی۔ خاص طور پر انہوں نے ان علما کو نشانہ بنایا جو صرف قدیم کتابوں میں محو ہیں اور جو موجودہ دور کے مسائل سے بے خبر ہیں۔ مولانا حالی کا خیال تھا کہ یہ علما جدید دور کی ضروریات اور چیلنجز کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس پر مولانا چریاکوٹی نے روایتی علما کے خلاف ایک مناظراتی انداز اختیار کیا۔ انہوں نے اصلاح کی بجائے محاذ آرائی کی راہ اپنائی۔ ان کا خیال تھا کہ علما کو اپنے علم میں تازگی لانی چاہیے اور انہیں نئے خیالات کو قبول کرنا چاہیے۔ یہ ردعمل مولانا چریاکوٹی کے تنقیدی نقطہ نظر کو ظاہر کرتا ہے، جہاں انہوں نے نئے خیالات کو تسلیم کرنے کی بجائے صرف روایتی علما کی خامیوں کو اجاگر کیا۔ اس کا مقصد علم کی درست سمت کی طرف رہنمائی تھا، لیکن ان کی سوچ میں اختلافات اور محاذ آرائی کا پہلو زیادہ تھا۔

اس معاملے میں، مولانا چریاکوٹی کے انداز میں بھی اصلاح کی بجائے تنقید اور محاذ آرائی کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ جس طرح مولانا حالی نے علما کی علمی پسماندگی پر زور دیا، اسی طرح مولانا چریاکوٹی نے اپنی علمی شناخت کو مضبوط کرنے کے لیے ایک جارحانہ رویہ اپنایا، تاکہ روایتی علما کو حقیقت سے آگاہ کیا جاسکے۔

شفاو مجسطی کی سیکھے جو حکمت ھے شایان دستار علم و فضیلت
نہ معلوم ھو جس کو اس کی حقیقت کریں طعن اس پر تو ھے یہ حماقت
خصوصاً نہ ھوں جو کسی فن سے واقف
ھر اک فن کے مخفی ھوں ان سے لطائف (۲۱)

مولانا محمد فاروق چریاکوٹی نے "مسدس عوالی" میں علی گڑھ کے تعلیمی نظام پر بھی تنقید کی اور جدید تعلیم کو اس کی ذمہ داری قرار دیا۔ خاص طور پر حالی کے بند ۲۳۴ کا جواب دیتے ہوئے، جس میں انہوں نے مسلمانوں کی جدید علوم سے بے خبری پر افسوس ظاہر کیا تھا اس بند کے جواب میں سر سید اور ان کے تعلیمی ادارے پر جو اندازِ تنقید اختیار کیا گیا ہے، وہ دیکھنے کے قابل اور حیرت انگیز حد تک شدید ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :

لیا مغربی علم کا نام تو نے ولیکن نہ اس سے لیا کام تو نے
نہ سیکھا کوئی علم اسلام تو نے کیا آپ کو مفت بدنام تو نے
نہ جانے جو دونوں کے سب خشک و تر کو
کرے وزن کب ان کے نفع و ضرر کو (۲۲)

فاروق چریا کوٹی کا بیان ہے کہ تم نے مغربی علم تو حاصل کیا، لیکن اس کا درست اور تعمیری استعمال نہیں کیا۔ صرف اس علم کا "نام" لے لیا، یعنی مغربی تعلیم کو سمجھنے اور اس سے مثبت فائدہ اٹھانے کی بجائے صرف اس کا دکھاوا کیا۔ مغربی علم کو اپناتے ہوئے اپنے اصل دین، اسلام، کے علم کو ترک کر دیا۔ نہ تم نے اسلامی تعلیمات سیکھیں، نہ اس کے اخلاقی و روحانی فوائد کو اپنایا۔ الٹا، مغربی تعلیم کی اندھی تقلید کر کے اپنی قوم کو بدنام کیا جیسے اسلامی اقدار سے دُوری اختیار کر کے اپنی شناخت کو نقصان پہنچایا۔ جو شخص دونوں (اسلامی و مغربی علوم) کی حقیقت کو نہیں جانتا یعنی جسے ان دونوں کے "خشک و تر" (یعنی گہرائی و سطحیت، فائدے و نقصان) کا ادراک نہیں وہ کیسے فیصلہ کرے گا کہ کون سا علم نفع بخش ہے اور کون سا نقصان دہ؟ ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے　　وہ روشن ہیں سب انٹرنس اور مڈل سے
انہیں سب کی تعلیم کے دے کے دھوکے　　کئے کتنے لوگوں کے خالی خزینے
نتائج بھی ہیں اس کے ان پر مرتب
کہ ہیں سب سرشتوں میں جو جانے مطلب (۲۳)

مولانا چریا کوٹی ان اشعار میں یہ واضح کرتے ہیں کہ مغربی تعلیم کی چمک دمک محض دھوکا ہے اگر اسے اسلامی اصولوں اور روحانی فہم کے بغیر اپنایا جائے۔

یہ تعلیم وقتی طور پر ترقی دے سکتی ہے، لیکن انسان کی فطرت، اخلاق، ایمان اور کردار کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور یہی اصل تباہی ہے۔ اس مغربی تعلیم نے کتنے ہی لوگوں کے "خزانے" یعنی عقل، وقت، دولت، کردار اور ایمان کو خالی کر دیا۔ لوگوں کو تعلیم کے نام پر بڑے بڑے خواب دکھائے گئے، لیکن ان کے بدلے وہ دھوکہ کھا گئے۔ یہ تعلیم ان کے باطن کو خالی، کھوکھلا، اور مادہ پرست بنا گئی۔

ہوئے پا کے تعلیم، ایماں کے دشمن　　مخالف شریعت کے قرآں کے دشمن
جہودوں سے بڑھ کر مسلمان کے دشمن　　عدو دیں کے قوم کی جاں کے دشمن
کسی کو جو پابند اسلام پائیں
تو مکر و دغا سے بلا میں پھنسائیں (۲۴)

چریا کوٹی کا کہنا ہے کہ کچھ لوگ جب مغربی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو وہ صرف دنیاوی ترقی حاصل نہیں کرتے بلکہ اس کے اثر میں آکر شریعتِ اسلامیہ کے "مخالف" اور قرآن کے "دشمن" بن جاتے ہیں۔ یہاں مراد یہ

ہے کہ مغربی افکار اور نظریات جب دین سے خالی ہوں، تو وہ انسان کو دین سے دور کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ ایمان کی بھی مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔

جو کالج سے ان کی ہوئی رفع حاجت — سر شتے میں لی جھد و کوشش سے خدمت
تو آیا کہیں لفظ "عند الضرورت" — تو دل پر لگی چھانے حیرت پہ حیرت
کہا ہندووں سے یہ حسن تمنا
کہ اس لفظ کا کیا ہے مفہوم و معنیٰ (۲۵)

فاروق چریا کوٹی نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ جب دین کی کوئی بات آتی ہے، جیسے پردہ، نماز، یا اسلامی اصول، تو وہ مغربی تعلیم یافتہ مسلمان ایک لفظ استعمال کرتا ہے" :**عند الضرورت** "(یعنی "اگر ضرورت ہو تو")۔ گویا دین میں نرمی یا رخصت لینے کا یہ سہل تر بہانہ ہے۔ جب چاہو دین کو اپنے مطلب اور ضرورت کی خاطر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لو۔ یعنی دین کو ذاتی خواہشات کے تابع کر دیا گیا۔ اسی طرح یہ مغربی تعلیمی اداروں (کالجز) سے نکل کر یہ لوگ اپنی زندگی کی ضرورتیں، خواہشیں اور معاشی مسائل تو حل کر لیتے ہیں (رفع حاجت ہو جاتی ہے)، یعنی دنیاوی لحاظ سے کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن دین کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔

مولانا قاضی محمد فاروق چریا کوٹی کے نزدیک اسلام کی سب سے بڑی علمی وراثت وہ کتابیں تھیں جو علمِ معقولات پر مبنی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان کتابوں کے ذریعے مسلمان فکری طور پر اپنی برتری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ نواب کلب علی خان کا کتب خانہ اس کی ایک عمدہ مثال تھا، جہاں علمِ معقولات کی اہم کتابیں جمع کی گئی تھیں۔

"مسدس عوالی" کے آخر کے دو بند اس علمی ورثے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں، یہاں تک کہ مسدس کا اختتام بھی نواب حامد علی خان کی تعریف پر کیا گیا ہے۔ مولانا چریا کوٹی نے اس مسدس کے ذریعے اس بات پر زور دیا کہ علمِ معقولات مسلمان کی فکری قوت کا اٹوٹ حصہ بھی ہے اوراہم اثاثہ بھی، اور اس علم کی حفاظت اور ترویج واشاعت ہماری فکری ضرورت بھی ہے اور ترقی کی ضامن بھی۔ بند ملاحظہ فرمائیے:

جو اسلام والوں کی ایجاد دیکھو — تو جارام پور اس کی بنیاد دیکھو
ہر اک علم اور فن کے استاد دیکھو — جمال بہار خدا داد دیکھو
مناظر آ کر کے مقالات دیکھو
کواکب کی گردش کے حالات دیکھو

وہ کیسے ہیں جن کے یہ ہیں بے بہا دُر ہیں نواب حامد علی خاں بہادر
کرم جس پہ کرتا ہے نازو تبختر ہنر کو ہے جس کے گہر پر تفاخر
ہر اک علم و صنعت کا وہ قدر داں ہے
رہے زندہ جب تک زمین و زماں ہے (۲۶)

حوالہ جات

۱۔ الطاف حسین حالی، مسدس حالی خدا بخش ایڈیشن (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵) ص 13۔
۲۔ اسماعیل پانی پتی، *تذکرہ حالی* (پانی پت: حالی بک ڈپو، ۱۹۳۵) ص ۹۷۔
۳۔ الطاف حسین حالی، مسدس حالی خدا بخش ایڈیشن (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵) ص 11۔
۴۔ سر سید احمد خان کو کافر، غدار، کرسچین، ملحد، انگریزوں کا وفادار، نیچری اور بہت سے القابات سے نوازا گیا یہاں تک کہ ان پر واجب القتل ہونے کے فتوے بھی اطراف ہندوستان میں شائع ہوئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) سرسید احمد خان علما کی نظر میں ،مولانا غیاث الدین دھام پوری، بصیرت آن لائن، اکتوبر ۲۰۲۲ https://baseeratonline.com (ii) مسٹر سر سید اور علمائے کرام، پٹیل عبدالرحمٰن مصباحی، https://urdudunia.com (iii) تحریک علی گڑھ اور سر سید احمد خان https://urdupub.com/ (iv) سر سید کی کہانی، سر سید کی زبانی قتل کی سازش (v) https://urdupub.com/ سر سید احمد خان کا فتویٰ، صالح میر، Thinknest.org (vi) سر سید احمد خان جنھوں نے اکثر بہت کڑوے طریقے سے اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔ https://urdu.arynews.tv
5۔ وسیم راشد، سر سید کے مخالفین (دہلی: اعلیٰ پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۸) ص ۵۲۔
۶۔ ارشد سراج ارشد، مسدس حالی کا تنقیدی مطالعہ (دہلی: جامعہ دہلی، ۱۹۹۷) ص ۱۲۳۔
۷۔ وسیم راشد، سر سید کے مخالفین، ص ۵۵۔
۸۔ شجاعت علی سندیلوی۔ حالی بحیثیت شاعر (لکھنو: ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۶۰) ص ۲۷۷۔
۹۔ محمد افروز قادری چڑیا کوٹی۔ علامہ محمد فاروق چڑیا کوٹی اور ان کے تین عظیم بیٹے (مؤ: نعمانی بک ڈپو، ۲۰۱۶) ص ۷۔
۱۰۔ ایضاً، ص ۸۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۸۔

۱۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: ایضاً، ص 6 تا ۲۲۔

۱۳۔ الطاف حسین حالی، مسدس حالی خدا بخش ایڈیشن ، ص۹۔

۱۴۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی، عوالی جواب مسدس حالی، مطبع اصح المطابع لکھنو،۱۳۱۹ھ، ص 1۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۴،۳۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۶۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۶۔